جناب بشیر احمد ڈار

عارفِ رُومی

مولانا جلال الدین رومی، جو عام طور پر مولائے روم یا مولانائے روم یا عارف رومی کے نام سے مشہور رہے ہیں، اسلامی ادب اور تصوف میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی مثنوی کے متعلق یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اس میں قرآن مجید کی اچھوتی تفسیر پیش کی گئی ہے اور اس کی تعریف میں یہ شعر بہت مشہور رہا ہے :

مثنوی مولوی معنوی　　　ہست قرآن در زبانِ پہلوی

اس مثنوی کی خوبیوں کو ہر زمانے میں حکما اور علما نے بیان کیا ہے اور خود ہمارے زمانے میں اقبال نے رومی کے افکار کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔

مولانا جلال الدین رومی ۶ ربیع الاول ۶۰۴ ہجری (مطابق ۱۲۰۷عیسوی) بلخ میں پیدا ہوئے جو ان دنوں افغانستان میں شامل ہے اور ان دنوں خوارزم شاہی حکمرانوں کا دارالسلطنت تھا۔ ان کے والد بہاء الدین محمد اپنے زمانے کے جید عالم اور بلند پایہ صوفی تھے۔ رومی نے ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کی۔ بہاء الدین فلسفہ و کلام کے مخالف تھے اور ان کا مسلک درویشانہ تھا۔ اس مخالفت کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہوگی کہ خوارزم شاہی دربار میں فخرالدین رازی جیسا بلند پایہ مفکر و فلسفی موجود تھا جسے اپنے منطقی استدلال اور فلسفیانہ تفکر کے باعث یقیناً نمایاں مرتبہ حاصل ہوگا جس کی وجہ سے شاید کچھ فخر و ادعا کی جھلک بھی ان کے طرزِ عمل میں پائی جاتی ہوگی۔ اور بہاء الدین کے دل میں اس کا ردعمل پیدا ہونا لازمی تھا۔

رومی نے مثنوی میں عقل و استدلال کے متعلق بحث کرتے ہوئے رازی کا نام بطور علامت استعمال کیا ہے اور اس کے پس منظر میں غالباً یہی صورتِ حال کارفرما تھی۔ فرماتے ہیں :-

کارِ استدلالیاں چوبیں بود !　　　پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

گر بہ استدلال کارِ دین بدے　　　فخر رازی رازدارِ دیں بدے

یعنی فلسفی کے دلائل کی مثال لکڑی کے پاؤں جیسی ہے جس پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا دین و مذہب کا معاملہ محض عقل و استدلال سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اگر ایسا ہو سکتا تو فخر الدین رازی سے بڑھ کر دین کا راز داں اور کوئی نہ ہوتا۔

مولانا روم کے اس علامتی استعمال سے اقبال نے بھی فائدہ اٹھایا اور اپنے کلام میں رازی کو بطور فلسفی پیش کیا ہے۔ بال جبریل میں کہتے ہیں۔

اس کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

لیکن درحقیقت سوز و سازِ رومی اور پیچ و تابِ رازی میں کوئی تضاد نہیں۔ انسان کی صحت مند نشوونما کے لیے دونوں ضروری ہیں اور معاشرے کا ارتقا دونوں کے مناسب استعمال پر مبنی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بلخ میں حالات اتنے ناسازگار ہو گئے تھے کہ رومی کے والد کو یہ شہر چھوڑنا پڑا۔ عام روایات میں اس جلاوطنی کا باعث امام رازی کی مخالفت کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن امام موصوف اس جلاوطنی سے چار سال پہلے فوت ہو چکے تھے۔ بعض مورخین نے اس روایت کو صحیح سمجھ کر یہ کہا ہے کہ بہاء الدین پہلے جب بلخ سے نکلے تو رازی زندہ تھے لیکن وہ پھر بلخ واپس آئے۔ کچھ دنوں تک وہاں رہے اور آخر کار اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ لیکن حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ بہاء الدین کے بلخ چھوڑنے کا باعث امام رازی یا کوئی اور شخص نہیں تھا بلکہ اس کی اصل وجہ وہ سیاسی اور معاشرتی حالات تھے جنھوں نے فضا کو کلی طور پر ناسازگار بنا دیا تھا۔ بہاء الدین بلخ سے ۱۲۱۲ء (۶۰۹ھ) میں نکلے اور اس کے چھ سال بعد ۱۲۱۸ء (۶۱۶ھ) میں چنگیز خان نے خوارزم شاہیوں کا خاتمہ کر دیا۔ منگولوں کے ہاتھوں یہ شکست فاش صرف خوارزم شاہی سلطنت کا خاتمہ نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے قائم کردہ نظامِ تمدن و معاشرت کا خاتمہ تھا اور ایسا خاتمہ یقیناً اچانک نہیں ہوا کرتا۔ مسلمانوں کی معاشرتی اور سیاسی زندگی مدت سے زوال پذیر تھی جس پر آخری ضرب چنگیز خاں کے ہاتھوں لگی۔ شاید بہاء الدین نے انہی حالات کو دیکھتے ہوئے بلخ چھوڑا ہو گا۔

پہلی منزل نیشاپور کا مشہور شہر تھا جہاں فرید الدین عطار (متوفی ۱۲۲۳ء/۶۲۰ھ) سے رومی کی ملاقات ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں عطار سے رومی کے متاثر ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عطار نے اپنی کتاب اسرار نامہ بہاء الدین کو دی۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ رومی نے عطار کی تصنیفات کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں :۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ما از پے سنائی و عطار آمدیم

یعنی عطار بمنزلہ روح کے ہے اور سنائی اس جسم کی دو آنکھیں۔ میں (یعنی رومی) سنائی اور عطار کے بعد آیا ہوں۔

نیشاپور سے یہ قافلہ بغداد پہنچا۔ جہاں مشہور زمانہ صوفی بزرگ عمر شہاب الدین سہروردی (متوفی ۱۲۳۴/ ۶۳۲ھ) سے ملاقات ہوئی۔ یہ بزرگ عوارف المعارف کے مصنف ہیں اور ان کی یہ کتاب صوفیوں کے حلقوں میں ہمیشہ مقبول رہی ہے۔ چند دن مدرسۂ مستنصریہ میں قیام کے بعد یہ قافلہ مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ حج کرنے کے بعد مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے وہ لارندہ پہنچے۔ جہاں رومی کی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں کر دی گئی۔ لارندہ میں قیام پانچ سال رہا۔

مغربی ایشیا میں ان دنوں سلاجقۂ روم حکمران تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ علاء الدین کیقباد نے بہاء الدین کو قونیہ آنے کی دعوت دی اور اس طرح رومی قونیہ پہنچ گئے۔ یہ واقعہ ۱۲۲۹/ ۶۲۶۔ ۶۲۷ھ) کا ہے جب رومی کی عمر تقریباً بائیس سال تھی۔ والد کی وفات کے بعد رومی ان کے مدرسۂ علم کے وارث ہوئے اور اس طرح انھوں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا جو بالکل علمی تھی۔ پڑھنا اور پڑھانا یہی ان کی زندگی کا مشغلہ تھا۔ اس جگہ اس حقیقت کا بیان ضروری ہے کہ وہ اس دور میں تصوف کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف تھے۔ بہاء الدین کے مرید برہان الدین محقق جب ان کی وفات کے بعد قونیہ پہنچے تو انھوں نے رومی سے کہا کہ تمھارے والد کی ایک امانت میرے پاس رہ گئی ہے، وہ اب میں تمھیں سونپ رہا ہوں۔ اور یہ امانت وہی طریقۂ تصوف تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض رسمی اور علمی شے تھی کیونکہ اس سے ان کی زندگی میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہوا۔

یہ عظیم انقلاب ۱۲۴۴/ ۶۴۲ھ میں رونما ہوا۔ شمس تبریزی ایک صوفی بزرگ تھے جو اچانک قونیہ میں نمودار ہوئے۔ شمس تبریزی کے متعلق ایک قیاس یہ ہے کہ وہ اسماعیلیہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ نفحات الانس کی روایت کے مطابق شمس تبریزی بابا کمال جندی کے مرید تھے جو ساتویں صدی ہجری کے ابتدائی ایام کے مشہور صوفی بزرگ تھے۔ عراقی ہمدانی اور شمس الدین تبریزی دونوں ان کے مرید تھے۔ عراقی کی عادت تھی کہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات

کو نظم میں لکھ کر اپنے مرشد کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ ایک دن بابا کمال نے شمس تبریزی سے کہا۔ بیٹا، کیا تمھیں اس قسم کے تجربات نہیں ہوتے جنھیں عراقی بیان کرتا ہے۔ انھوں نے مرشد کی خدمت میں عرض کیا کہ ایسے اور اس سے بہتر مشاہدات ہوتے ہیں، لیکن میں عراقی کی طرح انھیں الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہوں۔

شمس تبریزی اور مولانا روم کی ملاقات کی تفصیلات میں بہت اختلاف ہے جس کو بیان کرنے سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ رومی ایک خشک عالم اور زاہد تھے جو سلوک و جذب کی انتہائی منزلوں سے محض ناواقف تھے۔ جب انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے عشق و جذب کا ایک عجیب کرشمہ دیکھا تو وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے اور اپنا علم و تقویٰ شمس تبریزی کے عشق و جذب پر یک قلم قربان کر ڈالا۔ اس انقلاب کو سمجھنے کے لیے غزالی کے ایسے ہی انقلاب سے کچھ موازنہ کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے اور جہاں تک قدیم و جدید مآخذ و مصادر رہنمائی کرتے ہیں، اس اچانک انقلاب سے پہلے مولانا روم میں کوئی تڑپ، مقصد کی تلاش کا کوئی جذبہ یا بے اطمینانی کے جذبات کہیں ظاہر نہیں ہوتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ ایک مطمئن دنیا دار کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے اور اس میں یا ماحول میں کسی قسم کی تبدیلی کی تمنا کا اظہار ان کے ہاں نہیں ملتا۔ اگر ان میں تبدیلی ہوئی تو وہ داخلی واردات کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ خارجی اثرات سے پیدا ہوئی۔ اس کے برعکس غزالی کا ذہنی انقلاب ان کی داخلی نفسیاتی کشمکش کا نتیجہ تھا۔ ماحول کا اثر ضرور تھا لیکن اسی حد تک کہ وہ اپنے ماحول سے مطمئن نہیں تھے اور اس میں تبدیلی اور انقلاب کے متمنی تھے اور اس انقلاب کا بنیادی سبب داخلی تھا۔

دوسری بات جو رومی سے غزالی کو متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ جب غزالی میں انقلاب رونما ہوا، تو وہ بہت جلد اس سے بالا و ماورا ہو گئے۔ وہ فوراً اس منزل سے گزر کر ایک دوسری منزل پر جا پہنچے، جہاں سے وہ اپنی ذات، انفرادی ذات، کی مدد سے اپنے مقصد کی تکمیل میں منہمک ہو گئے۔ اس انقلاب نے، جو ان کی داخلی نفسیاتی واردات کا نتیجہ تھا، انھیں تکمیلِ ذات سے روشناس کر دیا۔ اس کے برعکس رومی جب اس انقلاب سے دوچار ہوتے جو جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، کلی طور پر

خارج سے ان پر وارد ہوا تھا، تو ان کی انفرادیت کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے وجود کی ضرورت موجود رہی۔ دو سال سے کچھ کم مدت تک رومی شمس تبریزی کی صحبت میں رہے۔ اس طرح کہ دونوں کا وجود گویا ایک تھا۔ اس نفسیاتی وحدت کا اندازہ یوں لگائیے کہ جب شمس تبریزی کی جدائی میں رومی نے غزل گوئی شروع کی تو تخلص شمس استعمال کیا۔ اس کے بعد صلاح الدین زرکوب کا ساتھ رہا۔ اور یہ دور کوئی نو یا دس سال تک جاری رہا۔ صلاح الدین زرکوب ۶۶۴ھ میں فوت ہوئے۔ تو رومی کو پھر تکمیلِ ذات کے لیے ایک دوسرے وجود کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس دفعہ انھیں حسام الدین چلپی کی رفاقت میسر آئی جو رومی کی وفات تک قائم رہی۔ رومی کی غزلیات اور مثنوی کی تخلیق اسی دوسرے وجود کی مرہونِ منت ہے اور رومی کی زندگی کا یہ پہلو نفسیاتی طور پر گہرے مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ شمس تبریزی کی صحبتوں سے رومی کو کیا حاصل ہوا؟ روایت یہ ہے کہ کچھ کم دو سال تک رومی کو یہ صحبت نصیب ہوئی۔ دونوں ایک حجرے میں مقیم ہوتے، پانی اور غذا کا کوئی فکر نہ ہوتا۔ کسی کو اس حجرے میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس دوران رومی نے کیا سیکھا؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں مہاتما بدھ اور غزالی کے تجربات کا مختصراً مطالعہ کرنا چاہیے۔ مہاتما بدھ نے طویل کشمکش کے بعد ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مراقبہ کیا جس کے بعد کہا جاتا ہے کہ ان کے قلب میں روشنی دکھائی دی جس سے ان کی ذہنی پریشانی ختم ہو گئی اور انھیں ان کے سوالوں کا جواب مل گیا۔ امام غزالی نے اپنی واردات کا ذکر اپنی مشہور کتاب منقذ میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "مجاہدات کے بعد اس (ذہنی) بیماری سے نجات اس نور سے ہوئی جو حضرت حق سبحانہ نے میرے دل میں ڈالا تھا اور یہی نور اکثر عرفانی امور کی کنجی ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرح صدر کے معنی پوچھے گئے تو آپ نے فرمایا کہ وہ ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتا ہے"[1] میں یوں کہوں گا کہ شمس تبریز کی صحبت میں مولانا کو یہی شرح صدر کا تجربہ ہوا۔ لیکن غزالی کے برعکس مولانا کا یہ تجربہ سکر و مستی سے پیوستہ رہا۔ کسی منزل پر بھی وہ مکمل صحو کی

---

[1] سرگزشت غزالی، اردو ترجمہ از مولانا محمد حنیف (طبع دوم)

حالت میں نہ رہے۔ شمس تبریزی سے جدائی کے باعث ان کی بے قراری نے آخر کار شعر و شاعری اور موسیقی و رقص کا لباس اختیار کیا۔ سلطان ولد نے رومی کے اس دور کے متعلق لکھا ہے:

روز و شب در سماع رقصاں شد　　بر زمیں ہمچو چرخ گرداں شد
یک زماں بے سماع و رقص نبود　　روز و شب لحظۂ نمی آسود

یعنی وہ شخص جو اس دور کا عظیم امام، عالم اور مفتی کہلانے کا مستحق تھا، اس نے روز و شب موسیقی اور رقص میں اپنا وقت بسر کرنا شروع کیا۔ جو کچھ دنیاوی مال تھا وہ سب لٹا دیا اور علم و تعلیم کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

جنون و جذب کی یہ حالت کوئی دو سال تک رہی۔ اس حالت میں وہ قونیہ کے بازاروں میں پھر رہے تھے کہ صلاح الدین زرکوب کی دکان سے گزرے۔ ورق کوٹنے کے لیے وہ ہتھوڑی چلا رہا تھا۔ جس کی ضرب نے رومی کے دل پر ایک معجزانہ اثر کیا۔ یوں معلوم ہوا کہ کوئی پیغام ہے جو ہتھوڑی کی ضرب انھیں دے رہی ہے۔ زرکوب نے اپنا ہاتھ نہ روکا اور جلد ہی رومی کے مضطرب قلب کو سکون نصیب ہوا۔ اس جذبِ عشق و جنوں کے زیر اثر رومی نے غزلیں کہنی شروع کیں جو دیوان شمس تبریز میں موجود ہیں۔

ان غزلوں کے مطالعے سے رومی کی نفسیاتی کیفیت اور جوشِ جنوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل چند اشعار دیکھیے:

اے خداوندے کہ یار جفا کارش دہ　　دلبرے، عشوہ گرے، سرکش و غمخوارش دہ

مرغ دماہی زمن شدہ حیراں　　کایں شب و روز چوں نمی خسپد
عشق برمن فسون اعظم خواند　　دل شنید آں فسوں، نمی خسپد

چوں نماز شام ہر کس بنہد چراغ خوانے　　منم و خیالِ یارے، غم و نوحہ و فغانے
بخدا خبر نہ دارم چو نماز می گزارم　　کہ تمام شد رکوعی کہ امام شد فلانے

نہ شبم، نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم چو غلامِ آفتابم ہمہ آفتاب گویم

لیکن وہ مخصوص ذہنی کیفیت جو مثنوی میں نمایاں ہے وہ ان غزلوں میں عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سکر و مستی کی جو کیفیت شمس تبریزی کے زیرِ اثر پیدا ہوئی تھی وہ صلاح الدین زرکوب کی صحبت سے نہ صرف قائم رہی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا۔ اگرچہ دیوان میں کہیں کہیں اس حالت کا عکس ملتا ہے جو مثنوی میں اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ مثلاً:

ما دل اندر راہِ دل انداختیم غلغلے اندر جہاں انداختیم
من ز قرآں برگزیدم مغز را پوست را پیشِ سگاں انداختیم
جبہ و دستار و علم و قیل و قال جملہ در آبِ رواں انداختیم
از کمالِ شوق تیرِ معرفت راست کردہ بر نشاں انداختیم

ایک دوسری غزل سنیے:

ساکنانِ راہ را محرم شدم ساکنانِ قدس را ہمدم شدم
گرچو عیسیٰ جملگی گشتم زبان گر لبِ خاموش چوں مریم شدم
آنچہ از عیسیٰ و مریم بادہ شد گر مرا باشد کنی آں ہم شدم
رو نمود اللہ اعلم ما مرّ! گشتۂ اللہ و بس اعلم شدم

صلاح الدین زرکوب ۶۶۴ ہجری میں فوت ہوئے۔ اس کے بعد مولانا روم نے حسام الدین چلپی سے تعلقات قائم کیے۔ یہی وہ دور ہے جب مولانا کے قلم سے ان کی لازوال مثنوی معرضِ تحریر میں آئی۔ سُکر سے صحو کی طرف یہ تبدیلی میرے خیال میں حالات کے زیرِ اثر ظاہر ہوئی۔

جس دور میں مولانا پیدا ہوئے وہ دور مسلمانوں کی تاریخ میں بہت خطرناک اور نازک تھا۔ چھ سو سال کی شاندار تمدنی تاریخ میں پہلی دفعہ مسلمانوں کو شکستوں کے ہاتھوں شکستِ فاش ہوئی تھی۔ مادّی طور پر تو اس کے نتائج بہت خطرناک اور دیرپا ثابت ہوئے۔ سارا نظامِ زراعت درہم برہم ہو گیا اور پانی مہیا کرنے کے لیے نہروں کا جو انتظام تھا وہ تباہ ہو گیا۔ جس کے باعث روزمرہ کی زندگی بُری طرح متاثر ہوئی۔ دوسری طرف منگولوں کے مظالم کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کسی شخص کی جان، مال اور عزت و آبرو محفوظ نہ تھی۔ ان حالات میں عام مسلمان کے ذہن میں اُلجھن پیدا ہونی شروع ہوئی۔ عام طور پر یہ خیال

آنے لگا کہ اسلام تو دنیا میں حکمرانی کے لیے آیا ہے اسباب یہ شکست کیسی؟ ذہنوں میں وساوس پیدا ہونے لابدی تھے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اپنے دین کو خیرباد کہہ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ یاس اور نومیدی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ فیہ مافیہ میں ایک جگہ مولانا مسلمانوں کی اخلاقی پستی کسی دوسرے شخص کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ اس زمانے میں مسلمان مغلوں کے آگے سجدۂ تعظیم بجالاتے ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ حرص و ہوا، کینہ اور حسد کے کئی بُت بنا رکھے ہیں جن کے تابع ہو کر وہ زندگی بسر کرتے ہیں[۲]۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا حوالہ دے کر اپنے ہم عصر مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں جو حالات کی خرابی کے باعث اپنے دین سے بیزار ہو چکے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرتؐ کے پاس آیا اور پکارا کہ مجھے یہ دین نہیں چاہیے۔ جب سے میں اس دین میں آیا ہوں، ایک دن آرام نہیں ملا۔ مال گیا، عزت گئی، بیٹا نہ رہا، عزت نہ رہی[۳]۔ منگولوں کے مقابلے میں شکست خوردگی کے شدید احساس سے بھی مسلمانوں میں اپنے دین کے متعلق بے شمار خدشات پیدا ہونے لگے تھے۔

دوسری طرف صلیبی جنگوں کی آفت نے مسلمانوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ چوتھی صلیبی جنگ ۱۲۰۴ء میں شروع ہوئی اور فرنگیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ پانچویں جنگ ۱۲۱۸ء میں شروع ہوئی لیکن اس کا رُخ مصر کی طرف رہا۔ چھٹی جنگ ۱۲۲۷ء میں سسلی کے حکمران فریڈرک نے شروع کی لیکن جلد ہی صلح ہو گئی جس کے باعث دس سال تک فرنگیوں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی طور پر امن رہا۔ لیکن فلسطین کے بیشتر علاقے عیسائیوں کے قبضے میں رہے۔ اور پھر مزید یہ کہ عیسائیوں نے مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو دیگر قوموں سے علیحدہ کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ فیہ مافیہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ایک دن عدوم کے کافر یعنی عیسائی کہتے تھے کہ ہم بیٹی تاتاریوں کو دیں تاکہ ہمارا اور ان کا دین ایک ہو جائے اور یہ نیا مذہب جسے اسلام کہتے ہیں مٹ جائے[۴]۔ اس کے علاوہ منگولوں اور عیسائیوں کے درمیان سیاسی روابط قائم ہونا شروع ہوئے پوپ کی طرف سے کوشش کی جانے لگی کہ منگولوں سے سیاسی تعلقات

---

[۲] ملفوظات رومی، اردو ترجمہ فیہ مافیہ از عبدالرشید تبسم (ادارۂ ثقافت اسلامیہ) صفحہ ۱۲۹

[۳] ایضاً، صفحہ ۱۲۸ [۴] ایضاً، صفحہ ۵۷-۵۸

قائم کیے جائیں تاکہ مسلمانوں کو نیست و نابود کیا جا سکے۔ منگول حکمرانوں کے عیسائی وزرا نے اس سلسلے میں مؤثر کردار ادا کیا۔

مولانا کو اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا خیال ہر وقت پریشان رکھتا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دن امیر پروانہ نے مولانا کی خدمت میں حاضر نہ ہونے کی معذرت کی کہ وہ مغلوں کے معاملات اور مشاغل میں مصروف ہونے کے باعث ان کی خدمت میں نہ پہنچ سکا۔ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ یہ کام اور مشاغل بھی دراصل خدا ہی کے کام ہیں کیونکہ یہ اسلام کے لیے امن و امان کا ذریعہ ہیں۔ آپ نے اپنا مال اور جسم فدا کیا ہے تاکہ مسلمانوں کے دل کو آرام ملے۔ پس جب تک چند مسلمان بھی امن اور چین کے ساتھ عبادت میں مصروف ہیں یہ کارِ خیر ہی ہے[۵]۔ لیکن جب اسی امیر پروانہ سے کوئی ایسا عمل سرزد ہوتا ہے جو مولانا کے نزدیک مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہوتا ہے تو فوراً اسے ڈانٹ پلا دیتے ہیں۔ ایک واقعہ کی تشریح کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے امیر پروانہ سے کہا کہ تو پہلے تو اسلام کے لیے پشت پناہ بنا کہ اپنے آپ کو اسلام پر فدا کرے۔ اپنی عقل رائے اور تدبیر کو بقائے اسلام اور کثرت اہل اسلام پر نثار کر دے تاکہ اسلام سلامت رہے (لیکن) چونکہ تو نے اپنی رائے پر اعتماد کیا اور حق کو نہ دیکھا، پس اللہ تعالیٰ نے عین اس سبب اور کوشش کو نقص اسلام کی وجہ بنا دیا کہ تو تاتاریوں میں گھل مل گیا ہے، تو (ان کو) مدد دے رہا ہے تاکہ شامیوں اور مصریوں کو تو فنا کر دے اور مملکت اسلام کو نہس نہس کر دے[۶]۔ یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ ۱۲۶۰ء میں مصر کے مملوک سلاطین کے نامور جرنیل بیبرس کے ہاتھوں منگولوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کے باعث ہلاکو خاں کے عیسائی ہونے کے امکانات بہت کم رہ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا روم اگرچہ ایسی مملکت میں رہتے تھے جو منگولوں کے ماتحت مسلمان امراء کے زیر نگین تھی، لیکن ان کی ہمدردیاں کلی طور پر شام اور مصر کے مسلمان حکمرانوں کے ساتھ تھیں۔ منگولوں کی یہ شکست درحقیقت اسلام کے دوبارہ ابھرنے کی علامت تھی اور مولانا کسی طرح بھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ وہ یا ان کا کوئی معتقد کسی ایسی تحریک میں ملوث ہو جو اسلام کے خلاف ہو۔

---

۵ ایضاً صفحہ ۳۳ ۶ ایضاً صفحہ ۲۳

میرا خیال ہے یہی وہ نازک حالات تھے جن کے باعث مولانا روم سکر کے غلبے سے نکل کر صحو کی منزل میں وارد ہوئے اور مثنوی جیسی کتاب لکھی، جس میں مسلمانوں کے لیے انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح ہدایات پیش کی گئی ہیں اور اس میں اس ذہنی پراگندگی کا علاج بھی موجود ہے جو اس دور میں مسلمان عوام اور دانشوروں میں پیدا ہو چکی تھی۔

اس ذہنی پراگندگی کی ایک عمدہ مثال رومی کی کتاب فیہ مافیہ میں ملتی ہے۔ مولانا بیان فرماتے ہیں کہ "ایک مسیحی جراح نے کہا کہ شیخ صدرالدین کے اصحاب میں سے ایک گروہ نے میرے پاس شراب پی اور کہا۔ عیسیٰ ابن مریم اللہ ہے جیسا کہ تم خیال کرتے ہو اور ہم اعتراف کرتے ہیں کہ یہی حق ہے۔ لیکن ہم قصداً اور ملت کی محافظت کے پیش نظر اسے پوشیدہ رکھتے اور اس سے انکار کرتے ہیں۔[۵]"

مولانا روم نے مسیحی کے اس بیان کی کہ شیخ صدرالدین کے اصحاب عیسیٰ ابن مریم کو اللہ خیال کرتے ہیں، تردید کی ہے اور کہا ہے کہ وہ غلط کہتا ہے۔ لیکن راقم کا خیال ہے کہ اس مسیحی کا بیان شیخ صدرالدین اور ان کے اصحاب کے متعلق بالکل صحیح ہے کیونکہ یہ ابن عربی کا عقیدہ تھا، جس کو انھوں نے واضح الفاظ میں فصوص الحکم میں بیان کیا ہے۔ ابن عربی کے نظریات سے متاثر ہو کر اگر کوئی شخص وحدت الوجود کے مابعد الطبیعی عقیدے کا قائل ہوگا، تو یہ بیان اس عقیدے کا منطقی نتیجہ ہے۔

اس کی تائید میں، میں پہلے عفیفی کی انگریزی کتاب سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں "ابن عربی کے نزدیک 'مسیح خدا ہے' کہنا بالکل صحیح ہے۔ اس لیے کہ ہر شے خدا ہے اور یہ کہنا کہ مسیح، مریم کا بیٹا ہے، یہ بھی صحیح ہے لیکن اگر کہا جائے کہ خدا مسیح ابن مریم ہی ہے تو یہ غلط ہے کیونکہ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ خدا مسیح ہے اور، اور کچھ نہیں۔[۶]"

اب خود فصوص الحکم کی طرف آئیے۔ فص عیسوی میں قرآن حکیم کی ایک آیت کی تشریح کرتے ہیں جس کو درحقیقت تشریح کہنا تو غلط ہوگا بلکہ تحریف کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ آیت یہ ہے "لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم" یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ،

۵۔ ایضاً صفحہ ۱۹۶ ۶۔ عفیفی، محی الدین ابن عربی کا متصوفانہ فلسفہ۔ طبع اول، صفحہ ۲۰ عنوان تشبیہ و تنزیہ

مسیح ابن مریم ہی ہے (۵، ۷۲) ابن عربی فرماتے ہیں۔ کفر کے معنی چھپانے کے ہیں اور ان لوگوں نے حق تعالےٰ کو جو مُردوں کو زندہ کرتا تھا عیسیٰؑ کی صورتِ بشری میں چھپا ڈالا تھا (اس واسطے اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی) اللہ نے ان لوگوں کو خطا اور کفر میں تمام اور پوری آیت میں جمع کیا ہے۔ وہ لوگ فقط "ہو اللہ" (یعنی مسیح اللہ ہے) کہنے سے کافر نہیں ہوئے اور نہ فقط "مسیح ابن مریم" کہنے سے کافر ہوئے بلکہ مجموعہ آیت ان اللہ ھو المسیح ابن مریم "(یعنی اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے) کہنے سے کافر ہوئے۔"

اس قسم کے نظریات یقیناً فکری پراگندگی کا باعث ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ایسے دَور میں جب کہ سیاسی اور فوجی شکست کے باعث مسلمانوں کی حالت مادّی اور ذہنی دونوں طرح خراب ہو رہی تھی ایسے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلمانوں کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ اوّل تو وہ راستہ جو ابن عربی، صدرالدین قونوی اور اس کے متبعین نے پیش کیا تھا یعنی نظریۂ وحدت الوجود، جس کی رُو سے اسلام و کفر، خیر و شر، جنت و جہنم میں کوئی فرق نہیں۔ اگر آپ مسلمان ہیں یا عیسائی، یہودی، یا مجوسی ہیں یا کسی عقیدے پر یقین نہیں رکھتے، سب نتائج کے لحاظ سے برابر ہیں۔ توحید کا عقیدہ بھی ویسے ہی صحیح ہے جیسا کہ شرک کا۔ دوسرا راستہ وہ تھا جو رومی نے مثنوی میں پیش کرنے کی کوشش کی اور جو اسلام کا راستہ تھا، وہ راستہ جو قرآن حکیم اور سنتِ رسولؐ نے پیش کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ان کی مثنوی کو "قرآن در زبان پہلوی" کہہ کر یاد کیا ہے۔

تاتاریوں کی یلغار کے سامنے مسلمانوں کو شکست ہوئی تو مسلمانوں کی ذہنی پراگندگی کا علاج مولانا روم کی نگاہ میں قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے میں تھا۔ اسی طرح اقبال نے اپنے زمانے میں مغربی اقوام کے تسلّط اور مغربی افکار کی یورش کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو قرآن و سنت کی طرف رجوع ہونے کا پیغام دیا اور اسی وجہ سے انھوں نے رومی کی اہمیت کو اجاگر کیا:

چو رومی در حرم دادم اذاں من — ازو آموختم اسرارِ جاں، من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او! — بہ دَورِ فتنۂ عصرِ رواں، من

پھر اپنے قارئین کو مشورہ دیتے ہیں:

بکامِ خود دگر آں کہنہ مے ریز — کہ با جامش نیرزد ملکِ پرویز

ز اشعار جلال الدین رومی به دیوارِ حریمِ دل بیا ریز

رومی کی قدر و قیمت کے متعلق اقبال ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

گرہ از کارِ ایں ناکارہ وا کرد غبارِ رہگذر را کیمیا کرد !

نےِ آں نے نوازے پاکبازے مرا با عشق و مستی آشنا کرد

یعنی رومی نے میرے جیسے ناکارہ آدمی کی مشکل کو حل کیا۔ رومی کے فکر نے ان تمام مشکلات پر قابو پانے میں میری رہنمائی کی جو میرے ناخنِ فکر سے وا نہیں ہوتے تھے۔ حکیم و عارف دونوں حقیقت کے متلاشی ہیں۔ حقیقت مطلقہ محمل نشین ہے۔ حکیم اس محمل کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے گرد و غبار میں اٹا ہوا ہے اور اسی غبار نے اسے دیدارِ دوست سے محروم رکھا ہے۔ لیکن عارف بڑھ کر محمل کا پردہ الٹ دیتا ہے اور دیدِ دوست سے بہرہ ور ہو جاتا ہے :

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رومی ذاتِ دوست میں گم ہو کر اپنا نیا وجود دریافت کرتا ہے اور لوگوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتا ہے :

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را اوست سید جملہ موجودات را

اقبال کہتے ہیں کہ یہ اسی پاک نہاد "نے نواز" کے کلام کا کرشمہ ہے کہ میں عشق و مستی کے راز سے آشنا ہوا۔

اقبال نے اپنے کلام میں اکثر جگہ رومی کے لیے نے نواز کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ بلکہ اس نے "نے نوازی" کو رومی کی فکر انگیز اور حیات پرور شاعری کی علامت کے طور پہ کئی جگہ برتا ہے۔ یہ نے نوازی درحقیقت اشارہ ہے رومی کی مثنوی کے پہلے شعر کی طرف :

بشنو از نے چوں حکایت می کند از جدائی ہا شکایت می کند

بانسری کی آواز سنو وہ اپنی جدائی کا قصہ بیان کر رہی ہے۔ یہ جدائی کیسی ؟ اور کس کی جدائی ؟ افلاطون کے ہاں عالمِ مثال کا تصور ہے۔ جہاں انسانی ارواح عالمِ وجود میں آنے سے پہلے موجود تھیں۔ وہی عالمِ مثل ان کا اصلی وطن ہے۔ اس دنیا میں آ کر بھی انھیں اپنا وطن یاد آتا رہتا ہے، اور اسی کی طرف روانہ ہونے کی تمنا رکھتی ہیں۔ افلاطون کے بعد فلاطینوس کے ہاں یہی

تصوّر موجود ہے۔ لیکن ان تمام تصورات میں ایک جزو یہ ہے کہ یہ روح اس مادّی جسم میں مقیّد ہے اپنی مرضی کے خلاف محبوس ہے اور اس کا مطمحِ نظر اس قید سے نجات ہے۔ لیکن اسلام میں یہ تصوّر ایک دوسری شکل میں موجود ہے۔ انسانی ارواح عالمِ بالا کی مکین ہیں، جہاں کبھی ذاتِ خداوندی سے انھیں شرفِ کلام حاصل ہوا تھا۔ الست بربکم؟ قالوا بلیٰ۔ کیا میں تمھارا رب نہیں رہا؟ روحوں نے جواب دیا تھا کہ ہاں! تو ہمارا رب ہے۔ اسی عالمِ بالا اور میثاقِ ازلی کی یاد روح کو اس عالمِ مادّی میں مضطرب رکھتی ہے۔ لیکن یہ اضطراب اس لیے نہیں کہ وہ اس "غیر مانوس، مادّی اور گناہ سے آلودہ" ماحول میں قید کر دی گئی ہے اور وہ اس سے نجات حاصل کرنے کی خواہش رکھتی ہے وہ مضطرب اس لیے ہے کہ وہ اس دنیا میں اُسی عہد کو پورا کرنے کی متمنی ہے جو وہ اپنے رب سے کر چکی ہے اور اس میں سرخروئی کی تمنا رکھتی ہے۔ اس کا مقصود دنیا سے فرار و گریز نہیں بلکہ اپنے رب و خالق سے ملاقات کی آرزو ہے۔ منزلِ ما کبریاست۔ یہی وہ اثباتی پہلو ہے جو اس اسلامی تصوّر کو افلاطونی یا نوافلاطونی تصوّر سے متمیز کرتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے بعض محققین مغرب سے مرعوبیت کے باعث ہر تصوّر کا ماخذ مغرب کے فکر میں تلاش کر کے خوش ہوتے ہیں۔

رومی نے اسی تصوّر کو مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے:۔

ما بفلک بودہ ایم یارِ ملک بودہ ایم! باز ہمانجا رویم خواجہ کہ آں شہر ماست
خود ز فلک برتریم، وز ملک افزوں تریم زیں دو چرا نگزریم منزلِ ما کبریاست

کبھی وہ دور تھا کہ ہم ماورائے فلک فرشتوں کے ہجوم میں اپنے اصلی وطن میں تھے۔ چونکہ وہ ہمارا وطن ہے اس لیے ہم پھر وہیں جانے والے ہیں۔ لیکن یہ فلک و ملک، آسمان اور فرشتے، محض عارضی منزلیں ہیں۔ ہماری آخری منزل مکانی و زمانی نہیں، وہ لامکاں و لازماں ہے۔ ہمارا منتہائے کار خود ذاتِ خداوندی ہے، ہماری منزل ربی الاعلیٰ اور ذاتِ کبریا ہے:

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

بانسری سے یہی فریاد ابھرتی ہے کہ وہ اپنی اصل سے دُور آ پڑی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ وہ دوبارہ اسی جگہ پہنچ جائے، جہاں سے اس کا سفر شروع ہوا تھا۔

بانسری یعنی انسانی روح کی یہ شکایت اور یہ نغمہ درحقیقت اس آگ کا نتیجہ ہے جو اس میں

موجود ہے۔ اگر یہ آگ موجود نہ ہوتی تو وہ بانسری اس طرح نغمہ پیرا نہ ہوتی۔ یہ آگ کیا ہے؟ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ آگ عشق سے پیدا ہوتی ہے۔

آتشِ عشق است کاندر نے فتاد　　جوششِ عشق است کاندر نے فتاد

اقبال نے اس سوز کا راز معلوم کرنے کے لیے عشق کی بجائے "دل" کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے؟　　اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے؟
دل کیا ہے، اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے؟　　کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تخت کے؟
جس روز دل کی رمز مغنّی سمجھ گیا!　　سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہست و بود طے!

اقبال کے یہ شعر مولانا روم کے مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح معلوم ہوتے ہیں:

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست　　از کجا می آید ایں آوازِ دوست؟
سرّ پنہان است اندر زیر و بم　　فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

یہ آلہ جس سے موسیقار مختلف نغمے نکالتا ہے بظاہر تو محض لکڑی، تاروں اور پوست کا مجموعہ ہے، لیکن اس سے وہ سرورِ مے کہاں سے آتا ہے؟ یا بہ الفاظ رومی جوششِ عشق یا آتشِ عشق کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ یہ پوشیدہ بھید دل کی دنیا سے وابستہ ہے۔ اگر ایک دفعہ دل کی دنیا آباد ہو جائے تو پھر یہ نغمہ کائنات کو زیر و زبر کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ لیکن یہ زیر و زبر تخریبی نہیں، تعمیر اور حیات پروری کے لیے ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

کیوں اس کی زندگی سے ہے اقوام میں حیات؟　　کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے؟
کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں　　جچتی نہیں ہے سطوتِ روم و شام و مے؟

لیکن اس عشق جہاں تاب و حیات پرور کے مقابلے پر رومی انسانوں کو حرص و آز سے محفوظ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ سیم و زر جمع کرنے کی آرزو انسان کو پابہ گل کر دیتی ہے اور زمین پیوستگی، روحانی قوتوں اور حیات بخش اجزا کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو رومی نے چند تشبیہات سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

انسان کو ایک پیالہ سمجھو اور اس دنیا کا مال و منال سمندر۔ اگر پورا سمندر بھی اس پیالے میں

انڈیل دوگے تو اس میں پانی اس پیالے کے ظرف کے مطابق ہی جمع ہوگا، اس سے زیادہ نہ اس میں گنجائش ہے اور نہ یہ گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے۔ فرماتے ہیں:

گر بریزی بحر را در کوزۂ در نگنجد قسمتِ یک روزۂ

ایک دوسری مثال بھی پیش کرتے ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ بارش کا ایک قطرہ جب سیپ کے منہ میں پہنچ جاتا ہے تو اس کے بعد وہ اپنا منہ بند کر لیتی ہے اور سمندر کی تہہ میں چلی جاتی ہے۔ یہی قطرہ بعد میں موتی بن جاتا ہے۔ اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

کوزۂ چشمِ حریصاں پُر نشد تا صدف قانع نہ شد پُر دُر نہ شُد

حریص کی آنکھ میں کبھی سیری نہیں آتی۔ مال کی کثرت بالکل بنیادی شے نہیں۔ سیپ پانی کے ایک قطرے پر قانع ہوئی تو نتیجہ موتی کی شکل میں برآمد ہوا۔ شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے کہ ہوس کا دائرہ تو ختم نہ ہونے والا ہے۔ اس کو صرف دو چیزوں سے سیری ہو سکتی ہے۔

یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

لیکن یہ قناعت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ یہ سوال آج بھی ایسا ہی اہم ہے جیسا کہ رومی کے زمانے میں یا سعدی کے دور میں تھا۔ انسان کی جبلّی خواہش کو جب غلط رنگ میں توسیع دی جاتی ہے تو حرص و آز کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باعث اس دنیا میں سرمایہ داری ذہنیت پیدا ہوئی جس کی وجہ سے انسانوں نے انسانوں پر ظلم کیے اور ان کا استحصال کیا۔ قرآن حکیم فرماتا ہے، کہ اے مسلمانو! تمھارے لیے رسول اللہ کا اسوہ قابلِ تقلید ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہ تھا کہ انھوں نے کبھی مال و منال جمع نہیں کیا۔

رومی کا خیال ہے کہ حرص و آز اور اسی قسم کی بیماریاں جو سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا کرتی ہیں ان کا علاج صرف عشق میں مضمر ہے:

ہر کرا جامہ ز عشقی چاک شد او ز حرص و جملہ عیبے پاک شد

شاد باش اے عشقِ خوش سودائی ما اے طبیبِ جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

عشق دجنوں کا جو شخص شکار ہو گیا۔ وہ تمام عیبوں سے پاک ہو گیا۔ یہ ایسا سودا ہے کہ تمام

نفسیاتی پیچیدگیاں ختم ہو جاتی ہیں، پھر کسی افلاطون یا جالینوس جیسے حکما کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

عشق کی فتوحات کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ اگر رسولِ اکرم کا خاکی جسم عالمِ افلاک کو عبور کر کے اپنے رب سے ملاقی ہوا تو وہ اسی عشق کی کرامت تھی۔ اور اگر کوہِ طور پر موسیٰ کلیم اللہ نے انوارِ تجلّی کا مشاہدہ کیا جس سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تو وہ بھی اسی "عشقِ خوش سودائی ما" کا کرشمہ تھا۔ یہ عشق ہی تھا جس نے رومی کو مجبور کیا کہ وہ اپنے دل کا حال لوگوں کے سامنے پیش کر دے۔ لیکن اس کے لیے کسی دمساز کی ضرورت تھی:۔

بالبِ دمساز خود گر جفتمی ہم چو نے من گفتنی ہا گفتمی

یہ دمساز مولانا کو حسام الدین چلپی کی شکل میں میسر آ گیا۔ جس کے باعث یہ مثنوی عالمِ وجود میں آئی

بقیہ : تاثرات

بورڈ آف گورنرز بینک کا صدر منتخب کرے گا جو پانچ سال کے لیے بینک کا انتظامی سربراہ ہوگا جدہ کانفرنس میں سعودی عرب کے وزیر مالیات کو صدر اور انڈونیشیا کے وزیر مالیات کو نائب صدر منتخب کیا گیا ہے۔

اسلامی ترقیاتی بینک کا قیام اسلامی تاریخ کا ایک اہم اور خوش آیند واقعہ ہے۔ جس کی وجہ سے دولت مند ممالک کو اپنا سرمایہ دوسرے ممالک کی بہتری کے لیے صرف کرنے اور ان کی اقتصادی حالت کو مستحکم بنانے کا موقع ملے گا۔ اسلامی ممالک میں اقتصادی تعاون و اشتراک سے سیاسی اور دینی رشتے بھی مستحکم تر ہو جائیں گے۔ اسلامی دینار ایک مشترک سکہ کی ضرورت پوری کر کے ڈالر اور اسٹرلنگ کی گرفت سے نجات دلا سکے گا اور اسلامی شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بینکاری کا یہ تجربہ اگر کامیاب ہو گیا تو سود کے بغیر یہ کاروبار کرنے کا مسئلہ حل ہو جائے گا جو موجودہ اقتصادی نظام میں مسلمانوں کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ بنا ہوا ہے۔

(رزاقی)